ذرائع ابلاغ کی طرف سے معاشرہ کو
یا در پدر آزاد بنانے کی کاوشیں

چند سال قبل تک شاید آپ نے اس کا نام بھی نہیں سنا ہوگا..... مگر اب جب سے ہمارے ذرائع ابلاغ کو نام نہاد آزادی حاصل ہوئی ہے اور انہوں نے اس آزادی کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے معاشرے کو مادر پدر آزاد بنانے پر اپنا سارا زور صرف کر دیا ہے، ان آزاد ذرائع ابلاغ کی پوری کوشش اس مقصد کے لیے ہے کہ معاشرے میں کوئی مثبت قدر باقی نہ رہ جائے، چنانچہ اس ہدف کے پیش نظر گذشتہ چند سال سے ''یوم بے غیرتی'' کے نام سے ایسا تہوار معاشرے میں متعارف اور رائج بلکہ زبردستی مسلط کیا جارہا ہے جس کے نام سے بھی ہمارا معاشرہ چند برس قبل تک آشنا نہیں تھا..... ''خوشی کے چند لمحات'' کا عجیب نشہ اور لالی پاپ یہ ذرائع ابلاغ لوگوں کے ہاتھ میں تھماتے ہیں کہ وہ ''مسرت'' کے حصول کے لیے باقی سب کچھ فراموش کر دیتے ہیں، وہ یہ تک بھول جاتے ہیں کہ ہم نے ایک اللہ کو اپنا خالق، مالک، رازق اور رب تسلیم کرتے ہوئے اس کی اطاعت کا عہد کلمہ طیبہ کو پڑھ کر کیا ہوا ہے اور اس کلمہ کے اقرار سے کچھ تقاضے اور کچھ ذمہ داریاں بھی ہم پر عائد ہوتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ کا یہ کمال ہے کہ ان ذمہ داریوں کی جانب توجہ بھی مبذول کروائی جائے تو فوراً بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کا ٹھپہ آپ پر لگا کر آپ کو نکو بنا دیا جاتا ہے، آپ اپنا اصولی مؤقف چھوڑ کر دفاع پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ پر مسلط لبرل اور سیکولر عناصر ایک ایسا اسلام متعارف کرانے کے لیے کوشاں ہیں، جس میں حدود وقیود نام کی کوئی چیز نہ ہو..... حرام حلال کی تمیز ہو، نہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے احکام پر عمل کا مطالبہ کیا جائے..... اور اسلام میں ''جہاد'' نام کی کسی چیز کا تو ذکر تک زبان پر نہیں آنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کیا قرآن وسنت کی تعلیمات کا نام ہے یا ان جدید دانشوروں کی سوچ وفکر اسلام کا ماخذ ہے، جس کے مطابق آپ جو چاہیں کریں، جہاں چاہیں جائیں، جیسے چاہیں رہیں ..... اچھلیں، کودیں، ناچیں، گائیں..... آپ کی مسلمانیت متاثر ہوتی ہے، نہ ہی آپ کے اسلام پر کوئی حرف آتا ہے.....!!!

اس روشن خیال اسلام کے علم بردار ایک جانب تو بہت سی دینی اقدار کو ''عربی رسوم'' قرار دے کر ہمارے معاشرے سے دیس نکالا دینے پر مُصر ہیں تو دوسری جانب ایسی ایسی چیزیں پروپیگنڈے کے زور پر یہاں مسلط کی جارہی ہیں، جن کی نہ ہمارا دین اجازت دیتا ہے اور نہ ہی مشرقی روایات انہیں قبول کرنے پر آمادہ ہیں، مگر یہاں گلوبل ویلیج کے فلسفے کا سہارا لیا جاتا ہے اور یہ کہہ کر انہیں اپنانے کا حکم لگایا جاتا ہے کہ پوری دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے، ہم ان عالمی رسوم ورواج سے الگ تھلگ کیسے رہ سکتے ہیں..... اس کام کے لیے کثیر القومی ادارے اندھا دھند سرمایا بھی فراہم کرتے ہیں اور رنگ برنگی ترغیبات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی اور اندھی تقلید میں مقامی اور سرکاری ادارے بھی اپنے قومی وسائل اس بھٹی میں جھونک دیتے ہیں اور ''گھر پھونک تماشا دیکھ'' کے مصداق اپنے ہاتھوں اپنی دینی وملی روایات اور اقدار کا جنازہ نکالنے میں مصروف ہوجاتے ہیں.....!!!

۱۴ فروری سے کئی ہفتے پہلے ہی سے ''آزاد'' ذرائع ابلاغ ایک ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں اور ''ویلنٹائن ڈے'' یعنی ''یوم بے غیرتی وبے حیائی'' کی آمد آمد کا ایک شور بپا ہوجاتا ہے۔

اخبارات اور ٹی وی چینلز کے لیے یہ اہم ترین مسئلہ قرار پاتا ہے اور اس کی تیاریوں کی خبریں ایسے ایسے زاویوں اور اتنی گھڑت سے دی جاتی ہیں کہ عید کی بھی کہاں دی جاتی ہوں گی..... عید مبارک کے کارڈ تو اب تقریباً متروک ہوچکے ہیں، مگر ویلنٹائن ڈے کارڈ، دل کی شکل کے سرخ غبارے، سرخ لباس، گلاب کا سرخ پھول اور ایسی ہی نہ جانے کیا کیا لغویات ۱۴ فروری کے حوالے سے اب ہمارے بازاروں اور دکانوں کی زینت بن رہی ہیں ..... ''ویلنٹائن ڈے'' یا ''عاشقوں کی عید'' کے نام سے متعارف کرائے

جانے والے اس تہوار پر نوجوان نامحرم لڑکوں اور لڑکیوں کو باہم اس نام نہاد محبت کے اظہار کی ترغیب دی جاتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور بے حیائی اور بے غیرتی ٹھیرایا ہے۔ یوں یہ ذرائع ابلاغ اس دن کے نام پر کھلم کھلا اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہیں اور شیطانیت کو فروغ دیتے ہیں۔ ان ذرائع ابلاغ پر اس دن کے موقع پر خصوصی ڈرامے، پروگرام، اشتہارات اور فیچرز تیار کرکے پیش کیے جاتے ہیں۔ اخبارات میں کئی روز پہلے سے اشتہارات شائع کیے جا رہے ہوتے ہیں کہ ''یوم محبت'' پر اپنے چاہنے والوں کے نام اپنے پیغامات انہیں بھیجے جائیں، جنہیں اس دن خصوصی اہتمام سے رنگین صفحات پر شائع کیا جائے گا۔ نام نہاد ''یوم محبت'' کے پرچارک یہ ذرائع ابلاغ اور روشن خیال دانشور اس بات کو سراسر بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بار بار مسلمانوں کو ان حرکات سے دور رہنے کا حکم دیا ہے، جن کی ترویج کے لیے وہ سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا سورۂ انعام کی آیت ۱۵۱ میں واضح ارشاد ہے کہ ''اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا پوشیدہ'' پھر ارشاد ہوتا ہے ''ان سے کہو، اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا..... کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ نہیں کہتے ہو جن سے متعلق تمہیں علم نہیں ہے۔'' اور سورۂ النور کی آیت نمبر ۱۹ تو شاید ان ذرائع ابلاغ میں بیٹھے ہمارے روشن خیال دانشوروں کے لیے ہی نازل فرمائی گئی ہے، اگر وہ توجہ اور غور فرمائیں، خالق کائنات اس آیت میں کس قدر واضح اور دوٹوک پیغام دے رہا ہے کہ ''جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔'' اے کاش ہم قرآن پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے چودہ سو سال پہلے ''چودہ فروری'' کی ''عاشقوں کی عید'' کے پرچارکوں کی کس قدر صاف الفاظ میں نشاندہی فرمادی تھیں.....!!!

پوری دنیا میں عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں اور دیگر کافروں کے ہاتھوں مسلمان دن رات گاجر مولی کی طرح کاٹے جا رہے ہیں، مگر ہم اس سے آنکھیں بند کرکے جشن منانے میں مصروف رہتے ہیں۔ پنجاب میں اگر ''یوتھ فیسٹول'' جاری ہے تو سندھ میں بھٹو کا نواسہ ''سندھ فیسٹول'' کے نام پر ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کیے ہوئے ہے۔ دھرتی کا بیٹا ہونے کے نام پر ''راجا داہر'' کو سندھ کا ہیرو قرار دینے والے ایک جانب پانچ ہزار سال پرانی موہن جو دڑو کی تہذیب سے رشتہ جوڑ کر فخر محسوس کرتے ہیں تو دوسری جانب نہ جانے کس طرح ''ویلنٹائن ڈے'' کو بھی اپنانے میں شرم محسوس نہیں کرتے کہ اس یوم بے حیائی کا آخر سندھ کی دھرتی اور سندھی تہذیب وثقافت سے کیا تعلق ہے؟ ''سندھی میلہ'' کے نام پر ۸ فروری کو بسنت نائٹ اور ۹ فروری کو بسنت ڈے منایا گیا اور ''بوکاٹا'' کا ہنگامہ مچایا گیا، لیکن اس ''سندھی میلہ'' کے نام پر ۱۴ فروری ''محبت کے نام'' کرنے کا اعلان بھی بڑے بڑے اشتہارات کے ذریعے کئی روز پہلے سے کیا جاتا رہا، آخر یہ کیسی سندھی ثقافت ہے جس میں سندھ کی مظلوم عورتوں کو راجا داہر سے نجات دلانے والا محمد بن قاسم تو بیرونی حملہ آور قرار پاتا ہے، مگر سات سمندر پار کے ویلنٹائن کی ایجاد کردہ رسم بے حیائی کو اپنانے اور ڈھٹائی سے آگے بڑھانے میں ذرا شرم وحیاء محسوس نہیں کی جاتی.....؟؟؟

ایک اور طرفہ تماشا اس حوالے سے یہ بھی ہے کہ ایک جانب تو عوام پر آئے روز نت نئے ٹیکس اس لیے مسلط کیے جا رہے ہیں کہ ملک کھربوں ڈالر کا مقروض ہے اور مزید قرضوں کے حصول کے لیے عالمی ساہوکار اداروں کی ظالمانہ شرائط تسلیم کرنے پر مجبور ہے، مگر دوسری جانب ''خوشی کے چند لمحات'' کے نام پر قومی خزانے کے اربوں روپے بسنت، میلوں ٹھیلوں اور ''یوم بے حیائی'' جیسے خودساختہ تہواروں پر بے دریغ ضائع کیے جا رہے ہیں اور نام نہاد خوشی کے حصول کے نام پر ہر اچھے برے، جائز ناجائز کام کو روا رکھا جا رہا ہے ..... کوئی ہے جو ان حکمرانوں کا ہاتھ پکڑ سکے ..... ان سے پوچھ سکے کہ غریب اور مقروض قوم کے اربوں روپے عیاشی اور فحاشی پر اڑانے کا اختیار آپ کو کس نے دیا ہے؟؟

مغربی تہذیب کا کرشمہ

انسان کی انسان سے بیزاری کی روش

لوگ کہتے ہیں کہ عالمی پیمانے پر بگاڑوفساد کے باوجود عذاب خداوندی کیوں نہیں نازل ہوتا، عذاب کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں، خالق کائنات کی قدرت بے پایاں ہے، قرآن جی آیت ایندی اس کی شان خدائی کا ظہور نئی نئی صورتوں میں ہوتا ہے، اس لیے عذاب بھی ایسی ایسی شکلوں میں آتا ہے، جن کو لوگ عذاب کی معروف شکلوں میں نہیں دیکھتے اور نہ بظاہر وہ عذاب معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ بسا اوقات عذاب کی معروف شکلوں سے بھی زیادہ خوفناک واذیت ناک ہوتا ہے، ایک شخص کو ہم تندرست وتوانا دیکھتے ہیں، نہ کہیں درد ہے، نہ بخار، لیکن وہ عجیب خوف وگھبراہٹ میں مبتلا ہوتا ہے، مایوسی، خطرات وحوادث کے وساوس اس کو گھیرے رہتے ہیں۔

مثلا یورپ کا سماجی، معاشرتی اور خاندانی شیرازہ جس طرح منتشر ہوا ہے، مرد وعورت دونوں ہی صنفیں جس طرح تنہائی وبے کسی محسوس کررہی ہیں، حتی کہ انس ومحبت جو فطرت انسانی میں داخل ہے، اس کو حاصل کرنے کے لیے کتوں کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئی ہیں کہ کتا اپنے آقا کا وفادار ہوتا ہے، کیا کہا جائے گا، اس تہذیب کو، جس میں انسان، انسان سے بھاگے اورخوف کھائے، لیکن کتوں سے محبت کرے، جو جانوروں میں بھی سب سے ذلیل سمجھا جاتا ہے، کیا یہ عذاب نہیں؟ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ انسانی خاندان کی کھلتی کلیوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، اس سے پیار ومحبت کرتا ہے، اس کی طفلانہ اداؤں اور معصومانہ مسکراہٹ اس کے دل کی دنیا کو باغ وبہار بنادیتی ہے۔ لیکن انسان جب ان کھلتی کلیوں کو مسل دیا کرے، توڑ کر پھینک دیا کرے تو کیا وہ انسان کہلانے کا مستحق ہوگا؟ ذرا تصور وخیال کی دنیا میں اپنے سامنے ایک معصوم بچے کی تصویر لایئے، بھولی بھولی موہنی سی صورت، معصوم سا چہرہ، خوبصورت آنکھیں، چھوٹے چھوٹے ہاتھ، ننھی ننھی انگلیاں، وہ کچھ ڈر اور خوف محسوس کرے تو ماں سے لپٹ جائے، باپ کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنے کو محفوظ قلعہ میں محسوس کرے، لیکن یہی ماں باپ جب اس کو اس لیے قتل کردیں کہ وہ ان کی رنگ رلیوں میں حارج نہ ہو، یا اس لیے قتل کردیں کہ ان کی غذا کا مسئلہ نہ پیدا ہو تو ایسے ماں باپ کو کیا کہا جائے گا، قتل یہی نہیں کہ چھری سے بچے کی گردن کاٹی جائے، قتل یہ بھی ہے کہ ماں کے رحم ہی میں جب کہ بچہ ابھی اپنی جسمانی ساخت وبناوٹ کے مراحل سے گذررہا ہے، کسی بھی ذریعہ سے اس کو ختم یا خارج کردیا جائے۔

کوئی صاحب عقل بتائے کہ آم کے باغ میں پھول آرہے ہیں، باغ والا اس کی دیکھ بھال میں لگا ہوا ہے، ایک شخص جاتا ہے اور پھولوں کو جھاڑنا شروع کردیتا ہے، کیا باغ کا مالک اس پھول جھاڑنے والے کے ساتھ وہی معاملہ نہیں کرے گا، جو آم توڑنے والے کے ساتھ کرتا ہے؟ پھر وہ مالک اس کو کیسے پسند کرسکتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں پلنے بڑھنے والے بچے کو ختم کردیا جائے۔

یہ تو بات ہوئی ان نوزائیدوں یا رحم مادر میں وجود پانے والے بچوں کی جو بیوی اور شوہر کریں خواہ وہ کسی بھی مذہب یا ملکی عرف ورواج کے مطابق ایک دوسرے سے جڑے ہوں، اس شادی والے رشتہ میں جڑے بغیر مرد وعورت کا باہمی ربط وملاپ انسانی سوسائٹی میں بہرحال معیوب ہی سمجھا جاتا ہے، اور فطری حیاء وشرم، گھر، خاندان یا سوسائٹی میں رسوائی کا خوف، کچھ تو روک لگاتا ہے، لیکن اسقاط حمل کو عالمی قانونی شکل دے کر اس بچی کھچی فطری حس کا بھی صفایا کردینا اور انسانی پستی کے لیے چوپٹ دروازہ کھول دینا، کیا اس انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے، جس کی دیگر مخلوقات پر فرماں روائی ہے، خنزیر اور کتوں سے بھی نیچے گرادینے کے مترادف نہ ہوگا، جو ذلت ورسوائی کے لیے بطور مثال بیان کیے جاتے ہیں۔

دنیائے جہاں سے باخبر ہر شخص جانتا ہے کہ یورپ اپنی سلگائی ہوئی آگ میں جل رہا ہے، اس بے حیائی کے عذاب سے اس کا خاندانی اور عائلی نظام ختم ہوچکا، وہ آوارہ جانوروں کی سی زندگی گذارنے پر مجبور ہوگیا ہے، لہٰذا چاہتا ہے کہ مشرق بھی اسی کی راہ پر چلے، اس نے پوری دنیا کو خصوصا مسلمانوں کو جن کے یہاں مذہبی اور عقائدی طور پر مکمل تحفظات ہیں، اپنی مخرب انسانیت چیزوں میں مبتلا کرنے کے لیے ریڈیو، ٹیلی ویژن،

فلموں، موبائل اور انٹرنیٹ کی صورت میں سارے جتن کرڈالے اور بدقسمتی سے تمام مسلمان ملکوں میں بھی اس کے برے اثرات بھی پڑے۔

اخلاقی انارکی، خاندانی اجاڑ اور معاشرتی بگاڑ کے ساتھ ساتھ یورپ کی آبادی بھی تیزی کے ساتھ گھٹتی جارہی ہے اور مشرق کی آبادی خصوصا مسلم ملکوں کی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے، اس لیے یورپ کو نفری طاقت کا خوف بھی کھائے جارہا ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ مسلم ممالک میں بھی وہ چیزیں پھیلیں، جن سے آبادی کم ہو۔

کائنات کے بنانے والے نے انسان کو اسی لیے پیدا کیا اور اس کو اس دنیا میں بسایا کہ اس کا نام زیادہ سے زیادہ لیا جائے، اس کی قدرت بے پایاں کا ظہور ہو، اسی لیے اسلام میں مسلم آبادی کو بڑھانے کا حکم ہے، فرمان رسول (ﷺ) ہے کہ ایسی عورت سے شادی کرو، جو خوب محبت کرنے والی اور بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت والی ہو۔ ایک اور موقع پر فرمایا: لہٰذا ہر وہ چیز جو اللہ کے منشاء کے خلاف ہو، فطرت انسانی کے بھی خلاف ہو اور انسانی مستقبل کے لیے خطرہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، اس لیے ہر ایسی کوشش انسانیت کی تباہی کا سبب بنے گی، انسانیت، مادی ومعنوی دونوں اعتبار سے تباہ ہوگی، یورپ ملحد وبے دین ہے، لہٰذا اس کے فکر کی رسائی صرف انسانی مفروضوں اور عقل انسانی کی حدود ہی تک ہوسکتی ہے، آگے کی بات وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اس کے لیے انبیاء کرامؑ کے علوم وتعلیمات کو ماننے اور تسلیم کرنے کی ضرورت ہے، یورپ، خاتم الانبیاء محمد ﷺ جن کی تعلیمات تمام انبیاء کی تعلیمات کے خلاصہ کے طور پر اب قیامت تک کے لیے حتمی ہوگئی ہیں، ان میں بھی شکوک وشبہات پیدا کرنے کی پوری کوشش کر چکا اور برابر کوئی نہ کوئی شوشہ اس کو ناکام وکمزور ثابت کرنے کے لیے چھوڑتا ہے اور وہ برابر اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ انسانوں میں جو لوگ مقصد آخرت کو مانتے اور تسلیم کرتے ہیں اور اس کے مطابق زندگی گذارنا چاہتے ہیں، وہ ان کے مقصد آخرت کو بھلادے اور ان کو بھی اپنے جیسا بالکل جانور بنادے اور وہ بہائم کی طرح زندگی گذارنے لگیں، انسانیت فنا ہو کر موت کی نیند سوجائے اور انسان آوارہ کتوں کی سی زندگی گذارے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

علماء کرام کی قدر و قیمت کے لئے
تین بنیادی جوہروں کی ضرورت

میرے عزیز طلباء! ایسے موقع پر اگر آپ رنجیدہ ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ موقع ہی ایسا ہے جو رنج ومسرّت دونوں کا جامع ہے، لیکن وہ ماں قابل مبارکباد نہیں، جو ہمیشہ اپنے بچوں کو سینے سے لگائے رہے، اور آنکھوں سے اوجھل کرنے کے لیے تیار نہ ہو، بلکہ اس کا ایک وقت مقرر ہے، اس وقت تک وہ بچے کی پرورش کرتی ہے، پھر وہی ماں اس بچے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کردیتی ہے، تاکہ وہ اس کی پیری کے لیے سہارا بن سکے، اسی طرح آپ نے ایک مدت یہاں گذاری، اس میں آپ کا ہم سے مانوس ہونا یا ہمیں آپ سے انس ہونا بالکل قدرتی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے اندر انس پیدا کیا ہے، لیکن انسانوں کے اندر یہ جوہر بہت زیادہ نمایاں ہے، صرف لسانیات ہی نہیں، نفسیات کے بھی بعض بڑے بڑے ماہروں کا یہ کہنا ہے کہ انسان کا لفظ اسی انس سے مشتق ہے، اس موقع پر یقیناً ہمیں اس حیثیت سے تو رنج ہے کہ آپ ہم سے جدا ہورہے ہیں، ہمارا آپ کا جو ایک ساتھ تھا، وہ چھوٹ رہا ہے، لیکن دوسری حیثیت سے ہمیں یہ مسرت ہے کہ آپ نے اپنی تعلیمی مدت حسن وخوبی کے ساتھ پوری کرلی، آپ نے اس زمانے میں جب کہ حالات بالکل ہی مخالف ہیں، اور زمانے سے سکون واطمینان رخصت ہوچکا ہے، دین کی تعلیم حاصل کی، اس حیثیت سے آپ قابل مبارکباد ہیں اور ہمیں اس پر دلی مسرّت ہے۔

فراغت کا غلط تخیل

لیکن ایسے موقع پر جب ''فارغ'' کا لفظ آتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں لوگ غلطی کریں، دارالعلوم کو ایک ایسی تعلیمی مدت تو رکھنی ہی چاہیے تھی، جس مدت کو آپ طے کرتے اور اس مرحلے سے فارغ ہوتے، لیکن اس موقع پر جو اہم بات آپ سے

کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ نے اس کا مفہوم یہ سمجھ لیا کہ ہم تعلیم سے فارغ ہوگئے، اب ہمیں تعلیم وتربیت کی کوئی ضرورت نہیں، تو بلاکسی حجاب اور تردّد کے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ آپ نے کچھ بھی نہیں سیکھا اور آپ کا ادارہ اپنے مقصد میں بالکل ناکام ہے، اور ہم لوگ بالکل ناکام ہیں، لیکن جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ نے فارغ ہونے کا یہ مفہوم نہیں سمجھا ہے، بلکہ فارغ ہونے کا مفہوم آپ کے نزدیک بھی یہ ہے کہ آپ اس قابل ہوگئے کہ کتابوں کو ہاتھ لگا سکیں اور حسب ضرورت ان سے استفادہ کرسکیں، بلکہ یوں کہا جائے کہ آپ کو اب علم کے حاصل کرنے کی کنجی دے دی گئی تو زیادہ صحیح ہوگا، آپ اس کنجی کے ذریعہ ہر قفل کھول سکتے ہیں، اور علم کے خزانے اپنے پاس جمع کر سکتے ہیں، آپ اس کنجی کو جتنا ہی استعمال کریں اسی قدر وہ کام دیتی چلی جائے گی۔

ہر نصاب کی ایک خصوصیت ہوتی ہے، اگر وہ نصاب اپنے فارغ شدہ طلباء کے اندر اس احساس کو پیدا کردے یعنی جہل کا اعتراف، شاید یہ لفظ بعض کانوں کو ناموس معلوم ہو، لیکن مجھے اس لفظ پر اصرار ہے، جسے لوگ ذوق علمی سے تعبیر کرتے ہیں، اگر آپ کے اندر یہ احساس پیدا ہوگیا ہے تو آپ کامیاب اور قابل مبارکباد ہیں، اور میں آپ کے ادارے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، اس کے بعد اس مختصر وقت میں اپنے جانے والے بھائیوں کو میں صرف تین باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔

اخلاص

پہلی چیز اخلاص ہے، آپ کسی بڑے سے بڑے بزرگ یا جس کا نام آپ دنیا میں روشن پاتے ہیں، اگر آپ اس کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو اس کی زندگی کی تعمیر میں اخلاص کو ایک اہم عامل پائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ اس کی ہر چیز کو اخلاص نے دوام بخشا ہے، آپ ملانظام الدینؒ کو دیکھ لیجئے، جن کی درسِ نظامی کا سکہ صرف ہندوپاک ہی میں نہیں اقصائے عالم میں چل رہا ہے، اور جس کو باوجود کوششوں کے اپنی جگہ سے ہلایا بھی نہیں جا سکا، محض ان کی علمیت کی بنا پر ایسا نہیں ہوا، بلکہ ان کے ساتھیوں اور ان کے معاصرین میں بہت سے ایسے اشخاص تھے، جو علم وفضل اور ذہانت وذکاوت میں اگر بڑھے ہوئے نہیں تو ان کے ہم پلہ ضرور رہے ہوں گے، لیکن کیا بات ہے کہ آج ملاّ نظام الدین تو زندہ جاوید ہیں، لیکن ان کے معاصرین کا تذکرہ اگر آتا ہے تو ان کے سلسلے ہی میں آتا ہے، اگر آپ غور کریں اور ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو اس کی پشت پر اخلاص کی وہ زبردست قوت کارفرپائیں گے، جس نے ملا نظام الدین کو قیامت تک کے لیے زندہ جاوید بنادیا، بات صرف اتنی تھی کہ انہوں نے پڑھنے کے بعد یہ محسوس کرلیا کہ انہوں نے کچھ بھی نہیں سیکھا ہے، اور انہوں نے اپنے زمانے کے ایک ایسے اُمّی شخص سے جو گوشۂ گمنامی میں اودھ کے ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں ''بانسہ'' میں اخلاص کا سرمایہ لے کر پڑا ہوا تھا، اپنے آپ کو متعلق کرلیا، اگر ملا نظام الدین چاہتے تو بہت سے ایسے بھی خدا کے بندے ان کو مل سکتے تھے، جو اپنے وقت کے امام تصور کیے جاتے تھے، لیکن ملاّ نظّام الدین نے اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے سپرد کیا، جس کی شہرت اگر ہوئی تو ملا نظام الدین کے ذریعے سے ہوئی، بہرصورت اس کی اگر مثالیں دی جائیں تو سیکڑوں مثالیں ملیں گی۔

جذبۂ قربانی

دوسری بات جو ہمیں آپ سے کہنی ہے، وہ ایثار وقربانی ہے، ایثار وقربانی اور عزم یہ وہ طاقت ہے کہ اگر افراد میں ہوتی ہے، تو انہیں ثریا تک پہنچا دیتی ہے، اور اگر کسی ادارہ یا قوم کے اندر پیدا ہوجاتی ہے تو دنیا اس کے سامنے جھک جاتی ہے، اور اس کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

جوہر ذاتی

اس کے بعد جو تیسری بات ہے، وہ جوہر ذاتی ہے، انسان کا ذاتی جوہر اور اس کی قابلیت ہی وہ چیز ہے، جو ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے، اگر آپ نے ان تینوں چیزوں یعنی اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی کو حاصل کرلیا ہے، تو آپ کے لیے زمانہ بالکل نہیں بدلا ہے، اور ہر وقت آپ کے لیے چشم براہ ہے، لیکن ان صفات سے اگر کوئی خالی ہے تو وہ جہاں بھی جائے گا، اور جس جگہ کی بھی سند یا ڈگری اس کے پاس ہوگی، حالات کو بدلا ہوا اور اپنے مخالف پائے گا، پھر میں کہتا ہوں کہ اگر آپ یہ صفات اپنے اندر پیدا کرلیں تو آپ کے لیے عالمگیر کا زمانہ، نظام الملک طوسی کا زمانہ، اور امام غزالی، امام رازی، امام ابن قیم، اور امام ابن تیمیہ کا زمانہ آج بھی منتظر ہے، اور وہ

آپ کے لیے واپس ہوسکتا ہے، یہ غلط ہے کہ زمانے میں کوئی جگہ خالی رہتی ہے، کبھی زمانے میں ایسا نہیں ہوا کہ کوئی جگہ پہلے سے خالی ہو اور کسی کی منتظر ہو کہ جب وہ شخص فارغ ہولے گا تو اس کو وہ جگہ مل جائے گی، زمانہ ''بقائے اصلح'' کا قائل ہے، وہ بہت ہی حساس اور نقاد ہے، وہ صالح کے بجائے اصلح اور نافع کے بجائے انفع کو ترجیح دیتا ہے، لہٰذا اگر آپ کے اندر یہ چیزیں ہیں، تو زمانہ آپ کا ہے، اور آپ کا منتظر ہے، زمانے کا شکوہ دراصل اپنی کمزوری چھپانے کی کوشش اور احساسِ کہتری کی علامت ہے، دنیا نہیں بدلی ہے، ہم بدل گئے ہیں، زمانہ آج بھی وہی ہے، جو پہلے تھا، تبدیلی صرف ہمارے اندر پیدا ہوئی ہے۔

آخری بات

اگر ہمارے سامنے یہ تصور اور یہ خیال نہ ہوتا تو یقیناً ہمارے لیے اس زمانے میں قطعا یہ جائز نہ تھا کہ ہم کسی ایک مسلمان بچے کو اس کے ماں باپ سے الگ کرکے ایسی تعلیم دلاتے، جس کی دنیا میں بظاہر کوئی قیمت نہیں، لیکن یہی باتیں ہیں: اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی، جس کی وجہ سے ہم کو اس کا پورا پورا حق حاصل ہے، اور اس کا پورا پورا جواز بلکہ ضرورت ہے کہ صرف ایک دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی نہیں، ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، اور اس طرح کے جتنے بھی ادارے قائم ہیں، وہ قائم رہیں اور ترقی کریں، ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ طلباء جو ہم سے رخصت ہورہے ہیں، وہ اپنی آنے والی زندگی میں ان اصولوں کو اپنائیں گے، اور وہ طلباء جنہیں ابھی موقع حاصل ہے، اور وہ کچھ سال یہاں گذاریں گے، زیادہ سے زیادہ ان اصولوں سے فائدہ اٹھائیں گے، اس کے ساتھ ہمیں اپنے رخصت ہونے والے بھائیوں سے یہ امید ہے کہ وہ اپنے دارالعلوم سے ہرحال میں تعلق رکھیں گے، اور اس کو اپنا نصب العین بنائیں گے۔

موبائل فون کی شعاعیں

مردوں کی تولیدی صحت کو متاثر کرسکتی ہیں

موبائل فون سے خارج ہونے والی شعاعیں مردوں کی تولیدی صحت کو متاثر کرسکتی ہیں، جناح سندھ میڈیکل یونیورسٹی کے تحت ہونے والی تحقیق کے نتائج کے مطابق موبائل کی شعاعیں دل، دماغ سمیت جسم کے کسی بھی عضو کو متاثر کرسکتی ہیں، تحقیق کے مطابق ۱۷برس کی عمر تک بچوں کو موبائل فون کا استعمال شدید نقصان کا باعث بن سکتا ہے، کیونکہ بچوں کی یہ عمر، ان کے دماغی خلیات سمیت جسم کی نشوونما کی ہوتی ہے، جو موبائل فون کے استعمال سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ موبائل فون کو دل یا جسم سے دور رکھنا چاہیے، موبائل فون کی شعاعیں جب موبائل پر کال آتی ہے اور جب اس کی بیٹری کمزور ہورہی ہوتو زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔

موبائل فون کو بستر کے قریب رکھ کر سونا بھی خطرناک ہوسکتا ہے، پاکستان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی تحقیق جناح سندھ میڈیکل یونیورسٹی کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ثروت جبین اور اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق نے ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی جناح سندھ میڈیکل یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سرور قریشی کی نگرانی میں سفید چوہوں پر مکمل کی ہے۔ اس تحقیق کو کانفرنس آف اناٹومٹس جو لاہور میں ۲۲/ مارچ کو منعقد ہوئی، تیسری پوزیشن کا ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ثروت جبین جو ڈاؤ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کہ طالبہ اور جے ایس ایم یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کررہی ہیں، نے اپنی تحقیق کی تفصیلات میں بتایا کہ ہماری تحقیق کا موضوع ''موبائل فون کی شعاعوں کے اثرات مردوں کی تولیدی صحت'' تھا، تحقیق کے فارمولے کے مطابق ہم نے یہ تحقیق سفید چوہوں پر کی، جن کا جنیاتی نظام تقریبا ۸۰ فیصد انسانی نظام کی طرح ہے۔

انہوں نے بتایا کہ تحقیق کے لیے ہم نے ۷۰ چوہوں کا انتخاب کیا۔ ان ۷۰ چوہوں کو ہم نے ۳۵،۳۵ کے ۲ گروپس میں تقسیم کیا جن کو اے اور بی کا نام دیا گیا۔ اے گروپ

کے چوہوں کو الگ رکھتے ہوئے ہم نے بی گروپ کے چوہوں کو ۵ پنجروں میں تقسیم کیا، جن کو ہم نے موبائل کی شعاعیں دیں، ہر پنجرے میں ۷ چوہے رکھے گئے اور ہر پنجرے کو بی 1 سے بی6 کا نام دیا گیا، ہر پنجرے میں چوہوں کو روزانہ ۲ گھنٹے کی شعاعیں مختلف عرصے کے لیے دی گئیں، یعنی ایک پنجرے کے چوہوں کو ۳۰ دن، تو دوسرے کو ۵۰ دن، اور چوتھے کو ۷۰ دن تک موبائل فون کی شعاعیں مختلف عرصے کے لیے دی گئیں، جن چوہوں کو سب سے زیادہ عرصے جو ۱۱۰ دن پر محیط تھا، موبائل فون کی شعاعیں دی گئیں، ان کا تولیدی عمل اتنا ہی متاثر پایا گیا، جبکہ اے گروپ کے چوہوں کے تولیدی نظام جن کو موبائل فون کی شعاعوں سے دور رکھا گیا، منفی اثرات سے محفوظ رہا، جس سے ثابت ہوا کہ موبائل فون سے نکلنے والی شعاعیں مردوں کے تولیدی عمل کو بھی متاثر کرسکتی ہیں، اسی تحقیق کے دوران یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ موبائل فون ٹاور کی شعائیں انسانی صحت کو متاثر کر سکتی ہیں، جب کہ مردوں کی طرح عورتوں کی تولیدی صحت پر بھی موبائل فون کی شعاعوں کے منفی اثرات ہو سکتے ہیں۔ تاہم ابھی اس پر تحقیق نہیں ہوئی ہے۔

ڈاکٹر سرور اور ڈاکٹر ثروت نے بتایا کہ موبائل فون کی شعاعوں کے منفی اثرات کا تعلق اس بات سے گہرا ہے کہ آپ موبائل فون کتنے عرصے سے استعمال کررہے ہیں اور موبائل فون کے استعمال کا دورانیہ روزانہ کتنا ہوتا ہے، انہوں نے بتایا کہ موبائل فون اگر شرٹ کی جیب میں دائیں جانب ہوتو موبائل فون کی شعاعوں اور دل کی دھڑکن کا ردہم آپس میں ٹکراتے ہیں، جو دل کے لیے نقصان کا باعث بنتا ہے، اسی طرح دماغی شعاعیں اور موبائل فون کی شعاعیں آپس میں ٹکراتی ہیں تو دماغ کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہیں جس میں خاص طور پر انسان کے لیے کسی خاص چیز پر توجہ مرکوز کرنا مشکل ہوجاتا ہے، جبکہ دماغی سرطان بھی ہوسکتا ہے، انہوں نے بتایا کہ سوتے وقت موبائل فون پاس رکھ کر سونا خطرناک ہوسکتا ہے۔ جبکہ ۱۷ برس تک بچوں کو موبائل فون نہیں استعمال کرنا چاہیے، کیونکہ یہ عمر دماغی خلیات اور دیگر اعضاء کے بننے کی ہوتی ہے۔ موبائل فون کا استعمال انہیں متاثر کرسکتا ہے، انہوں نے بتایا کہ موبائل فون کی شعاعیں سب سے زیادہ اس وقت متاثر کرتی ہیں جب اس پر فون آتا ہے یا اس وقت جب اس کی بیٹری کمزور ہوگئی ہو۔

شمس الحق ندوی

حب مال وحب جاہ کے طوفان میں
امت مسلمہ کی ذمہ داری

انسان تمام جاندار مخلوقات میں سب سے زیادہ افضل اور عقل وسمجھ رکھنے والا قدرت کا بنایا ہوا شاہکار ہے، جو اچھے برے، شریف ورذیل، سچ وجھوٹ، اہل وناہل، باصلاحیت وبے صلاحیت کی تمیز رکھتا ہے، تمیز ہی نہیں رکھتا، بلکہ اسی اعتبار سے معاملہ بھی کرتا رہا ہے، جب کبھی اس کے خلاف ہوا ہے تو صالح انسانی سوسائٹی نے اس کو شرف انسانیت کے خلاف سمجھا ہے، اس پر احتجاج کیا ہے۔

غلط رویہ اپنانے والے، سوسائٹی میں اچھی نظروں سے کبھی نہیں دیکھے گئے، مگر ہمارے زمانہ کی قدریں بالکل بدل چکی ہیں، جو چیزیں انسان کے لیے باعث ذلت وعار سمجھی جاتی تھیں، اب وہی عزت وشرف کی باتیں سمجھی جانے لگی ہیں۔

انسانی زندگی کی گاڑی کو چلانے والوں میں بھی اہل وناہل کا فرق برابر کیا جاتا رہا ہے کہ یہ کام نازک اور ذمہ دارانہ ہوتا ہے، لہٰذا اس کے حصول کے لیے لوگ علمی ذوق وشوق اور تحقیقی مطالعہ میں امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اپنی دیگر صلاحیتوں کو بھی بڑھانے اور اس میں امتیاز پیدا کرنے میں کوشاں رہتے تھے، لیکن آج مختلف ذمہ داریوں کو انجام دینے اور منصب وعہدوں پر فائز ہونے کے لیے ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ ان طریقوں سے حاصل کیے جاتے ہیں، جو سارے اصولوں کو توڑ کر اپنائے جاتے ہیں، جس میں کسی بااثر کی قرابت یا سفارش کافی سمجھی جاتی ہے، چاہے اس سے بہت فائق اور بہتر صلاحیت کے لوگ موجود ہوں اور اگر یہ ذرائع حاصل نہیں تو حل المشکلات رشوت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، جس کے ذریعہ سب کام آسان ہوجاتے ہیں، مجرم اور قاتل تک، اس کے سائے میں پھولتے پھلتے رہتے ہیں، جس کے نتیجہ میں آج زندگی کی ہر کل ڈھیلی اور بے کل ہے، مشرق سے لے کر مغرب تک اس وقت یہی صورتحال رواج پاچکی ہے، جس نے ہر خوب کو ناخوب اور ہر ناخوب کو خوب بنادیا ہے، اخلاقی انارکی اور بے حیائی کا یہ عالم ہے کہ۔

ان پر آشوب اور جگر خراش حالات میں ان لوگوں کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے جو قرآنی حقائق پر اور قرآن لانے والے رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ صرف ایمان رکھتے ہیں، بلکہ ان کے اوپر ضلالت وگمراہی کے اس بحر ظلمات سے قوموں کو نکالنے کی ذمہ داری بھی ڈالی گئی ہے، یہ کہہ کر:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (مومنو! جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو، اور برے کاموں سے منع کرتے ہو)۔ (آل عمران/۱۱۰)

امت مسلمہ ہی ان ساری بیماریوں کی طبیب ومعالج ہے، جو سارے عالم پر چھائی ہوئی ہیں اور اسلام وقرآن ہی وہ مرکز شفا ہے جہاں پہونچ کر یہ بیماریاں دور ہوتی ہیں، لہٰذا اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ تمام سطحی اور وقتی چیزوں سے بلند ہو کر، انسانیت کی تعمیر کے لیے کمر کس لیں کہ یہ انہیں کا کام ہے اور وہ نسخۂ کیمیا انہیں کے پاس ہے جو انسانیت کے تن مردہ میں جان ڈالتا ہے۔

ہم اپنی بات انسانیت اور ملک وملت کا درد رکھنے والے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ کے موقع پر کی گئی تقریر کے ایک اقتباس پر ختم کرتے ہیں جس میں "**كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ**" کی پوری تصویر آ گئی ہے، اور جن کی پیام انسانیت کے موضوع پر اندور میں تقریر سن کر آر ایس ایس کے ایک ممبر نے حضرت مولاناؒ کی قیام گاہ پر آ کر حضرت مولانا سے ملنے کے بعد کہا کہ آپ کی تقریر سن کر اندازہ ہوا کہ: ''آپ کو ہم سے زیادہ ملک کی فکر ہے۔'' حضرت مولانا نے فرمایا تھا کہ:

''آج ملک خودکشی کے لیے قسم کھا چکا ہے، وہ آگ کی خندق میں گرنے کے لیے تیار ہے، وہ بداخلاقی اور انسانیت کشی کے دلدل میں ڈوب رہا ہے، آپ ہی ہیں جو ہندوستان میں کیا، بلکہ پورے ایشیا میں اس ملک کو بچا سکتے ہیں، آپ اللہ اور رسولؐ کی بات کہیے، آپ کو کوئی ضرورت نہیں کہ آپ نیلام کی منڈی میں اتر آئیں، اور آپ سودا کرنے لگیں کہ ہماری بولی بولی جائے، آپ متاع نایاب ہیں، اللہ کے سوا آپ کی خریداری کا کوئی حوصلہ نہیں کرسکتا، اس لیے میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں، کاش میں آپ کے دلوں اور دماغوں پر چوٹ لگا سکتا، میں صرف آپ سے کہتا ہوں کہ اس ملک کو صرف آپ تنہا بچا سکتے ہیں، اس لیے کہ آپ کے پاس عقیدۂ توحید اور انسانی اصول ومساوات ہے، آپ کے پاس اجتماعی عدل کا مکمل نظام موجود ہے، آپ ہی ہیں جو ہر چیز سے بالاتر ہیں، آپ ہی ہیں جن کے پاس ایمان بالآخرۃ ہے، اور جو "**العاقبة للمتقين**" پر یقین رکھتے ہیں، آپ ان لوگوں میں سے نہیں جن کی نظر طاقت اور قوت پر رہا کرتی ہے، اور جن کی نگاہ میں مال ومتاع اور اکثریت ہی سب کچھ ہے، اور نہ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو انتخابات میں کامیابی اور پارلیمنٹ تک پہونچ جانی ہی کو سب سے بڑی معراج سمجھتے ہیں۔''

عالم اسلام میں اسلامی داعیوں کے کرنے کا اصل کام

ضرورت یہ ہے کہ لادینیت کی اس طوفانی موج کا مقابلہ کیا جائے، جو عالم اسلام کے سر سے گذر رہی ہے، نہیں بلکہ آگے بڑھ کر اس کے قلب ومرکز پر حملہ کیا جائے، وقت کا تجدیدی کام یہ ہے کہ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کے اساسات وعقائد، اس کے نظام وحقائق اور رسالت محمد ﷺ پر اعتماد واپس لایا جائے، جس کا رشتہ اس طبقے کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔

آج کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ اس فکری اضطراب اور ان نفسیاتی الجھنوں کا علاج بہم پہنچایا جائے، جن میں آج کا تعلیم یافتہ نوجوان بری طرح گرفتار ہے اور اس کی عقلیت اور علمی ذہن کو اسلام پر پوری طرح مطمئن کردیا جائے، آج کا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ جاہلیت کے وہ بنیادی افکار جو دل ودماغ میں گھر کر گئے ہیں، ان سے علم اور عقل کے میدانوں میں نبردآزمائی کی جائے، یہاں تک کہ اسلام کے اصول ومبادی پورے ایمانی جذبات کے ساتھ ان کی جگہ لے لیں۔

کامل ایک صدی گذرتی ہے کہ یورپ ہمارے نوجوان اور ذہین طبقے پر چھاپے مار رہا ہے، شک والحاد، نفق وارتیاب کا ایک طوفان ہے، جو اس نے ہمارے دل ودماغ میں برپا کر رکھا ہے، غیبی اور ایمانی حقائق پر اعتماد متزلزل ہورہا ہے اور ریاست اور اقتصاد کے مادہ پرستانہ نظریات اس جگہ پر قابض ہورہے ہیں، کامل ایک صدی سے اس شکست وریخت کا سلسلہ جاری ہے، لیکن ہمیں اس کے مقابلے کی کوئی فکر نہیں ہوئی، ہم نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی، وقت کے تقاضوں کے مطابق قدیم علمی ترکہ پر اضافہ کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔

ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی کہ یورپ کے ان فلسفوں کو سمجھیں اور پھر ان کا علمی محاسبہ بلکہ سرجنوں کی طرح ان کا پوسٹ مارٹم کریں، ہمارا سارا وقت سطحی بحثوں کی نذر ہوتا جارہا ہے، یہاں تک کہ اس صدی کے آخر میں ہمارے سامنے گویا یکا یک یہ منظر آیا کہ ایمان وعقیدہ کی دنیا متزلزل ہے اور ایک ایسی نسل تیار ہوکر برسراقتدار آچکی ہے، جو نہ اسلام کے عقائد ومبادی پر ایمان رکھتی ہے نہ اسلامی جذبات اور اسلامی حمیت سے معمور ہے اور نہ اس کا کوئی تعلق اپنی مومن ومسلم قوم سے اس کے سوا ہے کہ قومیت کے خانے میں اس کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا ہے، اگر کچھ تعلق ہے تو وہ محض سیاسی مصالح کی حد تک، بس، اس کے سوا کوئی تعلق نہیں، اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر صورتحال یہ ہے کہ لادینی مزاج اور لادینی انداز فکر، ادب وثقافت اور صحافت وسیاست کے راستے سے جمہور تک پہونچ چکا ہے، اور مسلمان قوموں کے سر پر عمومی پیمانے کی لادینیت کا خطرہ منڈلا رہا ہے، خاکم بدہن! وقت کی رفتار وہ وقت قریب لارہی ہے کہ اسلام کو زندگی کے میدان میں کہیں بے دخل کرکے نہ رکھ دیا جائے۔

دعوت ایمان

یہ وقت عالم اسلامی میں ایک نئی اسلامی دعوت کا متقاضی ہے، اس دعوت وجدوجہد کا نعرہ اور نشانہ ہو ''آؤ پھر سے اسلام پر ایمان پیدا کریں،'' لیکن تنہا نعرہ کافی نہیں ہے، اس سے پہلے وہ نفسیاتی راستہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے، جس سے عالم اسلامی کے موجودہ برسراقتدار طبقہ کے دل ودماغ تک پہنچایا جا سکے اور اسے اسلام کی طرف لوٹایا جائے۔

بے غرض داعیوں اور مردان کار کی ضرورت

آج عالم اسلامی کو ایسے مردان کار کی ضرورت ہے، جو صرف اسی دعوت کے پیچھے ہو رہیں، اپنا علم، اپنی صلاحیتیں اور اپنا مال ومتاع اس کے لیے وقف کردیں، کسی جاہ ومنصب یا عہدہ وحکومت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں کہ کسی کے لیے ان کے دل میں کینہ وعداوت نہ ہو، فائدہ پہنچائیں، مگر خود فائدہ نہ اٹھائیں، دینے والے ہوں، لینے والے نہ ہوں، ان کا طرز عمل سیاسی رہنماؤں کے طرز عمل سے ممتاز اور ان کی دعوت وجدوجہد سیاسی تحریکات (جن کا مطمح نظر محض حصول اقتدار ہوتا ہے) مختلف اور جداگانہ ہو، اخلاص

ان کا شعار ہو اور نفس پرستی، خود پسندی اور ہر قسم کی عصبیت سے بالاتری ان کا امتیاز۔

دعوت کے لیے نئے علمی اداروں کی ضرورت

آج ایسے علمی ادارے عالم اسلامی کی بڑی اہم ضرورت ہیں، جو ایسا طاقتور اسلامی ادب پیدا کریں، جو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دوبارہ کھینچ کر اسلام، وسیع معنی میں اسلام کی طرف لاسکے، جو انہیں مغرب کے ان فلسفوں کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکے، جنہیں ان میں سے کچھ نے سوچ سمجھ کر اور زیادہ تر محض وقت کی ہوا سے متاثر ہو کر حرز جان بنا لیا ہے، وہ ادب جو، ان کے دماغوں میں ازسرنو اسلام کی بنیادیں اٹھائے اور قلب وروح کی غذا بنے، اس کام کے لیے عالم اسلامی کے ہر گوشے میں آج ایسے ارباب کی عزیمت درکار ہے، جو معرکے کے اختتام تک اس علمی محاذ پر جمے رہیں۔

میں اپنے بارے میں صراحت کے ساتھ بتا دینا چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی لمحے اور کسی وقفے میں بھی ان لوگوں میں نہیں رہا ہوں، جو دین وسیاست کی تفریق کے قائل ہیں، نہ میں ان لوگوں میں ہوں، جو دین کی ایسی تعبیر کرتے ہیں، جن سے وہ زندگی کے ہر نظام اور حالات کے ہر سانچے میں (خواہ وہ اسلام سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو) فٹ ہوجائے اور ہر رنگ کی سوسائٹی میں جڑ جائے اور نہ میرا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہے، جو سیاست کو قرآن کے شجرہ معلونہ "**الشجرة الملعونة فی القرآن**" کا مصداق سمجھتا ہے، میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں جو مسلمان قوموں میں صحیح سیاسی شعور کے داعی ہیں اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں، میں ان لوگوں میں ہوں، جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا، جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو، میں اس کا داعی ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک رہوں گا۔

ماضی کے تجربے

لیکن بات ترتیب اور تقدیم اور تاخیر کی ہے، دینی حکمت اور دینی تفقہ کی ہے اور سوال، حالات کے تقاضے کا ہے، اب تک ہماری کوششیں اور ہماری صلاحیتیں، ہمارے وسائل اور ہمارے اوقات سیاسی اور تنظیمی تحریک کے نذر ہوتے رہے ہیں اور یہ ساری جدوجہد، حرکت اس مفروضے پر رہی کہ قوم میں پورا پورا ایمان ہے اور قوم کی قیادت جو لامحالہ تعلیم یافتہ طبقے ہی سے ہوتی ہے، وہ بھی پوری طرح مسلمان ہے، اسلام کے عقائد ومبادی پر اس کا ایمان ہے، اسلام کی سربلندی کے لیے اس کے دل میں جوش وجذبہ ہے اور حدود واحکام کے نفاذ کے لیے بھی وہ تیار ہے، حالانکہ بات برعکس ہے، قوم کا حال یہ ہے کہ ایمان میں ضعف اور اخلاق میں انحطاط آچکا ہے، لیکن اس کا نہ ہمیں پتہ چلا، نہ خود قوم کو شعور ہوا، تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے کا حال یہ ہے کہ مغربی فلسفوں اور سیاست واقتدار کے اثر سے بیشتر افراد میں عقیدہ گویا پگھل چکا ہے، بلکہ بہت سوں کا حال تو یہ ہوچکا ہے کہ اسلامی عقیدے کے کھلے باغی اور مغربی فلسفوں کے لائے ہوئے افکار وعقائد پر دل کی گہرائیوں سے ایمان، ان کے لیے دنیا سے لڑ جانے کا جوش وولولہ اور ان کی نشرواشاعت کا جنون، یہ فکر کہ زندگی کا نظام ان فلسفوں کی روشنی میں اور ان کی دی ہوئی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور یہ کوشش کہ پوری قوم کو اس لادینیت سے مانوس کیا جائے، یہ ہے اس طبقے کے بہت سے افراد کا ذہنی حال، پھر عمل کے میدان میں بعض جلد باز ہیں، بعض تدریج کے قائل، بعض اس لادینی رجحان کو طاقت کے زور سے قوم پر ٹھونس دینا چاہتے ہیں اور بعض قوم کو اس شیشے میں خوبصورتی کے ساتھ اتارنے کی راہ پر گامزن ہیں، مگر منزل سب کی ایک اور مقصد وہدف سب کا واحد۔

دینی طبقے کے دو متضاد گروہ

اس طبقے کے بارے میں ہمارا دینی طبقہ بشرطیکہ یہ تعبیر درست بھی ہو، کیونکہ اسلام میں کوئی مخصوص دینی طبقہ اور پاپائیت جیسی کوئی چیز نہیں ہے اور اپنے رویہ کے اعتبار سے دو گروہوں میں تقسیم ہے، ایک گروہ ہے، جو اس سے برسرجنگ ہے، اس کی تکفیر کرتا ہے اور اس کے سائے سے بھی دور رہنا پسند کرتا ہے۔ لیکن ان اسباب وعلل کی جستجو سے بالکل مستغنی ہے، جنہوں نے اس طبقے میں لادینیت کا رجحان پیدا کیا، یہ گروہ اس کا قائل نہیں ہے کہ اس طبقے میں اختلاط پیدا کیا جائے، دین سے اس کی وحشت دور کی جائے، اگر کوئی ایمان وخیر کا ذرہ اس میں موجود ہے تو اسے بڑھاوا دیا جائے، مؤثر اسلامی لٹریچر کے ذریعہ اس کے اندر دینی افکار اتارے جائیں، اس کے جاہ ومال اور قوت واقتدار سے استغناء دکھا کر، اسلامی کردار کی عظمت کا نقش قائم کیا جائے، مخلصانہ اور حکیمانہ نصیحت کی جائے، اور

اس طرح اس کے احوال اور دل ودماغ کو بدلا جائے۔

دوسرا گروہ اس کے بالکل ضد ہے، وہ اس طبقے سے تعاون کرتا ہے، مال وجاہ میں اس کا شریک بنتا ہے، اس کے ذریعہ اپنی دنیا بناتا ہے، اس کا دین سنوارنے کی کوئی فکر نہیں کرتا، پس اس گروہ میں نہ کوئی دعوتی روح ہے، نہ دینی غیرت کا مظاہرہ، نہ یہاں اس بگڑے ہوئے طبقے کی اصلاح کی کوئی حرص وفکر پائی جاتی ہے اور نہ اسے اس قرب وتعاون میں کوئی پیغام ملتا ہے۔

اصلاح اور دینی انقلاب کیلئے جس گروہ کی ضرورت ہے

ایسا کوئی گروہ نہیں، جو اس صورتحال پر دردمند ہو، جو یہ سمجھے کہ یہ اونچا تعلیم یافتہ طبقہ مریض ہے، مگر علاج کے لائق اور شفایابی کے قابل اور پھر اس کے علاج کی فکر کرے، حکمت ونرمی کے ساتھ دین کی دعوت لے کر اس میں گھسے اور بے لوث نصیحت کا حق ادا کرے، ایسا کوئی تیسرا گروہ نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اس مغرب زدہ عنصر کو دین اور دینی ماحول سے قریب ہونے کا کوئی موقع نہیں ملتا، اس کی ساری زندگی اس ماحول سے وحشت اور دوری میں کٹتی ہے اور پھر اس کے بعد وحشت کو اہل دین کا گروہ اور بڑھاوا دیتا ہے، ایسے ہی ایک گروہ بھی اس کے بعد وحشت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے جو دین کے نام پر اس طبقہ سے جا وہ منصب اور حکومت وسلطنت کے لیے جنگ کرتا ہے، یہ دونوں گروہ سوائے اس کے کچھ نہیں کرتے کہ اس طبقہ کو دین سے خائف کریں اور ایک بغض وعناد کی کیفیت پیدا کریں، انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ دنیا کا حریص ہے تو اس معاملہ میں اپنے کسی رقیب کو برداشت نہیں کرسکتا، اگر حکومت وسلطنت ہی اس کا مقصد زندگی ہے تو اس میدان کے حریف کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا اور اگر بندہ نفس اور خوگر عیش وعشرت ہے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ دنیا میں کسی کو سہیم وشریک بننے کی اجازت دے دے۔

عالم اسلامی کے درد کی دوا

عالم اسلامی کے درد کی دوا آج وہ گروہ ہے، جو خواہشات سے بلند اور داعیانہ بے غرضی کا پیکر ہو، ہر اس بات سے دامن بچائے، جس سے وہم بھی ہوسکتا ہے کہ اسے دنیا کی طلب ہے یا اس کا مطمح نظر اپنے لیے، اپنی پارٹی کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے حکومت واقتدار کا حصول ہے، وہ گروہ جو اس طبقے سے میل ملاقات کے ذریعہ، مراسلات اور گفتگو کے ذریعہ، دعوتی اسفار کے ذریعہ، اسلامی ادب کے ذریعہ، شخصی روابط کے ذریعہ، پاکیزگی کردار اور علو اخلاقی کے ذریعہ، زہد واستغناء اور پیغمبرانہ اخلاق کی پر اثر نمائندگی کے ذریعہ ان نفسیاتی اور عقلی گرہوں کو کھول دے جو مغرب نے پیدا کی ہوں یا دینی طبقے کی بے تدبیری سے پڑی ہوں یا کم فہمی، کم نظری اور اسلام اور اس کے صحیح ومناسب ماحول سے بُعد ان کا سبب ہوا ہو۔

تحریر: مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
ترجمہ: محمد وثیق ندوی

اسلامی تحریکوں کے لئے

ٹکراؤ کی بجائے دعوت واصلاح کی ضرورت

موجودہ دور میں جو لوگ مسلمانوں کے مسائل اٹھاتے اور انہیں موضوع بحث بناتے ہیں، وہ اپنی ساری توجہ وتوانائی دشمنوں کی سازشوں، اور ان کے منصوبوں پر صرف کرتے ہیں، ان وسائل پر زور دیتے ہیں، جو دشمنان اسلام مسلمانوں کے خلاف رائے عامہ تیار کرنے اور اسلام کی شبیہ مسخ کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں، مسلمان، جس پسماندگی، پستی، غربت وافلاس، بے کاری اور آپسی تنازعات سے دوچار ہیں، اس کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہی ڈالی جاتی ہے، عالم اسلامی وعربی میں فساد وبگاڑ، خانہ جنگی، آپسی کشمکش اور خلفشار وانتشار کا سبب اسلام کو ٹھہراتے ہیں۔

لیکن حقیقت میں وہ اس بحث ومباحثہ کے پس پردہ مغرب کی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں، ان مقالات میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ مغربی ملکوں میں باہمی تعاون اور تال میل قائم ہے، مغرب نے تعلیم وتربیت کے میدان میں ترقی کی ہے، اقتصادی سیکٹر میں بہتری آئی ہے، اس کے پاس ایسے وسائل وذرائع ہیں، جن کی بنا پر پسماندہ اور غریب ملکوں کی وہ مدد کرتا ہے، حالانکہ یہ پسماندہ ممالک آبادی اور طبعی وسائل وذخائر کے اعتبار سے مغربی ملکوں سے کہیں زیادہ فائق ہیں۔

اسی طرح سامراج کی طویل تاریخ پر بحث کی جاتی ہے، جس میں یورپ نے پوری دنیا کو اپنے تسلط وقبضہ میں کرلیا اور اور اپنے مفادات کی خاطر اور توسیع پسندانہ عزام کو بروئے کارلانے کے لیے مغلوب ملکوں کے وسائل کا استحصال کیا، پھر ان ملکوں میں ایسے عناصر اور افراد پیدا کردیے، جو اپنے ملکوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، انتشار، ٹکراؤ اور کشمکش کا سبب بنتے ہیں اور اپنے عوام اور قوم کو اس پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ غاصب ملکوں پر اعتماد کریں، ان سے مدد طلب کریں، حالانکہ ان غاصب ملکوں نے ان پسماندہ ملکوں کی دولت وثروت کا استحصال کیا اور ایک ایسی نسل تیار کردی جو ایجنٹ کی حیثیت سے کام کررہے ہیں اور ان ملکوں کی نقالی اور تقلید کی ترغیب دیتے ہیں، جن ملکوں نے ان کو غلام بنایا اور مسلسل ان مظلوم ومغلوب ملکوں پر اقتدار وتسلط کا منصوبہ بناتے رہتے ہیں، عالم اسلام کی موجودہ صورت حال اس کی واضح دلیل ہے، بنگلہ دیش اور پاکستان سے لے کر مصر، شام، عراق، تونس اور لیبیا تک یہی یکساں صورت حال ہے۔

یقیناً یہ تمام پہلو اہم اور فیصلہ کن ہیں اور بہت سے مسلم ملکوں میں وسائل اور مشکلات پیدا کرنے میں ان کا اہم رول رہا ہے، لیکن فطری طور پر یہاں ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ وہ کون سی رکاوٹ ہے، جو ان ملکوں کو سازشوں، چال بازیوں اور دسیسہ کاریوں سے نجات دلانے میں حائل ہورہی ہے؟ اور تخریبی منصوبوں کا مقابلہ کرنے سے کون سی چیز مانع آرہی ہے اور ذلت آمیز صورت حال سے چھٹکارا پانے کی ان کی کیا تیاریاں ہیں؟

ابھی گذری ہوئی صدی کے حالات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ صرف عالم اسلام ہی مغربی سامراج اور مغربی منصوبوں کا نشانہ اور ہدف نہیں تھا اور تنہا یہی جنگوں، آزمائشوں اور مصائب ومشکلات سے دوچار نہیں ہوا، بلکہ بہت سے دوسرے ممالک بھی عالم اسلام سے زیادہ سخت آزمائشوں، پریشانیوں اور بڑی محرومی اور ظلم سے گذرے ہیں۔

جرمنی اور جاپان ایک طویل عرصہ تک جنگ سے دوچار رہے، بڑی مغربی طاقتوں کے ظلم وستم کا شکار ہوئے، لیکن یہ دونوں ملک زبردست تباہی وبربادی کے باوجود عالمی جنگوں کے نتائج واثرات سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، حالانکہ عالمی جنگوں نے ان دونوں ملکوں کو بالکل تباہ وبرباد کر ڈالا تھا، لیکن یہ دونوں ملک بڑی حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کا ثبوت دیتے ہوئے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے، یہی نہیں، بلکہ جہد مسلسل، عمل پیہم، بہتر منصوبہ بندی اور ملکی وقومی اتحاد کے ذریعہ عالمی طاقتوں کے برابر ہوگئے اور ان سے مقابلہ کرنے لگے۔

یہی صورتحال کمیونسٹ چین کے ساتھ بھی پیش آئی، ایک زمانہ تھا، جب کہا جاتا تھا کہ چینی گمنامی کی زندگی گذار رہے ہیں، اور زندگی کے میدان میں ان کا کوئی رول نہیں،

لیکن چین میں ایک ایسا انقلاب رونما ہوا، جس نے صورتحال بدل دی، انقلاب کے بعد چین کو سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی ملکوں کی طرف سے دھمکیوں، چیلنجوں اور دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، اس کا بائیکاٹ کیا گیا، اس پر پابندیاں عائد کی گئیں، لیکن چین اپنے وسائل، افرادی قوت اور اپنی ذاتی صلاحیت وطاقت سے فائدہ اٹھائے ہوئے بغیر کسی خارجی امداد وتعاون کے، زندگی کے میدان میں ڈٹا رہا، پھر وہ وقت آ گیا کہ دنیا نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا اور اس کے لیے دروازے کھول دیے، اس کے بعد چین نے ان ملکوں کو جو اس سے برسرپیکار تھے، اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ تعاون کریں، انجمن اقوام متحدہ کا ممبر منتخب کر لیا گیا، یہی نہیں، بلکہ سلامتی کونسل میں اس کو ویٹو پاور کا حق حاصل ہوگیا، حالانکہ ایک وہ وقت تھا، جب اس کے سامنے ترقی کی ساری راہیں بند کر دی گئیں، اس کا عرصہ حیات تنگ کرنے کے لیے سارے حربے استعمال کیے گئے، لیکن چین نے اپنی قوت ارادی، مضبوط اور ٹھوس منصوبہ بندی اور تنظیمی صلاحیت اور اپنے ملکی وسائل پر بھروسہ اور خوداعتمادی کے ذریعہ تمام پریشانیوں اور مصائب پر قابو پالیا، اس نے مخالف عالمی طاقتوں کے سامنے سرتسلیم خم نہیں کیا، اپنے اصول ونظریات اور اپنے فلسفۂ حیات پر مضبوطی سے قائم رہا، بڑی طاقتوں کے مطالبات اس نے تسلیم نہیں کیے، اور نہ ان سے نرم رویہ اختیار کرنے کی اپیل کی۔

مغرب نے کمیونزم کے خلاف جو جنگی مہم چلائی، وہ سنگینی اور خطرناکی میں اس مہم سے کم نہیں، جو آج مغرب، اسلام کے خلاف چلا رہا ہے، عرصہ دراز تک کمیونزم، مغربی سامراجی ملکوں کی دشمن رہی اور مغرب نے بھی اس کے مقابلہ کے لیے اپنے سارے علمی، فکری، ثقافتی، سیاسی اور عسکری وسائل استعمال کر ڈالے۔

شمالی کوریا کے ساتھ بھی یہی صورتحال پیش آئی، لیکن وہ بھی اپنے موقف پر ڈٹا رہا، اس نے مغرب کے کسی چیلنج اور دھمکی کے سامنے سرتسلیم خم نہیں کیا اور آج بھی اس نے اس امریکہ کے سامنے سپر نہیں ڈالی، جو کہ اس وقت عالمی سپر پاور ہے، اور نہ اس نے کسی دھمکی کی پروا کی، وہ پوری قوت کے ساتھ اب بھی اپنی پالیسی پر قائم ہے۔

گذشتہ صدی سے مغربی طاقتوں نے اسلام کو مرکز توجہ بنایا اور اسلام کو کمیونزم اور نازی ازم سے زیادہ خطرناک خیال کیا، اور اس کو صفحہ ہستی سے مٹانے اور بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنی ساری قوت لگادی ہے، لیکن اس صورتحال سے ڈرنے اور خائف ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، بلکہ استقلال وپامردی، حوصلہ مندی اور اولوالعزمی، حکمت ودانشمندی، صبر وثبات ٹھوس پلاننگ وتنظیم اور دینی واسلامی روح کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ امت اسلامیہ واحدہ کی صفوں میں اتحاد وتعاون، دینی وملی شعور، ایثار وقربانی، احساس ذمہ داری، دینی غیرت وحمیت اور صحیح اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ مغربی ملکوں نے کمیونزم اور نازی ازم کو ختم کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی اور کمیونسٹ ملکوں نے فکری، ثقافتی اور قومی تشخص وشناخت باقی رکھنے کی جو کوشش کیں، ان کو ناکام بنانے میں مغربی طاقتوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن باہمی اتحاد وتعاون، احساس خودی، اپنے وجود کی بقا کی فکر، ذاتی وسائل وذرائع پر اعتماد وبھروسہ اور کسی بھی قیمت پر سرتسلیم خم نہ کرنے کے عزم وارادے نے ان ملکوں کے تشخص کو باقی رکھا، اور ان ہی امتیازات وخصوصیات کی بنا پر ہر طرح کے چیلنجوں، منصوبوں اور دھمکیوں کا مقابلہ کیا، چنانچہ زندگی کے ہر میدان میں کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوئے، اور جو ملک ان سے وسائل وقوت میں ممتاز تھے ان سے فوقیت لے گئے اور زندگی کے ہر میدان میں اپنی شناخت اور قومی خصوصیت باقی رکھی۔

ایک فلسطینی وفد نے جنوب مشرقی ایشیا کی تحریک آزادی کے ایک لیڈر سے ملاقات کی، جس نے مغربی سامراجی طاقتوں کے خلاف کامیابی حاصل کی تھی، اس ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ فلسطین کی جنگ آزادی میں اس سے مدد لی جا سکے، اور اس کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جا سکے، لیکن اس لیڈر نے فلسطینی وفد کو بہت سخت جواب دیا اور کہا تم لوگ مجھ سے مشورہ لیتے ہو، حالانکہ میں نے تمہاری ہی روشن تاریخ سے مزاحمت ومقابلہ کا طریقہ لیا ہے اور تمہارے اسلاف کی جہادی روح سے بھرپور استفادہ کیا ہے، گویا اس لیڈر نے فلسطینی وفد کو بھلایا ہوا سبق یاد دلایا۔

دشمن سازشیں رچتے ہیں، منصوبے بناتے ہیں، یہ ان کا حق ہے کہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے خلاف منصوبہ بندی کریں، مسلمانوں کو قرن اول میں مختلف قسم کے خطرات، چیلنجوں، سازشوں اور تخریبی منصوبوں کا سامنا کرنا پڑا، مسلمانوں کی روشن تاریخ اس کی گواہ ہے، لیکن مسلمانوں نے کبھی تو بے سروسامانی وبے بضاعتی کے ساتھ طاقتور دشمن کا

مقابلہ کیا، اور کبھی فکری وثقافتی یلغار کا سامنا کیا، جبکہ اس میدان میں بھی دشمن علم وفن کے اسلحہ سے لیس تھا، لیکن اس عدم توازن کے باوجود مسلمانوں نے اپنے عزم واستقلال، استقامت وعزیمت، احساس خودی وخوداعتمادی، دین سے گہری وابستگی پر مضبوطی سے قائم رہنے کی بنا پر ہر طرح کے خطروں، چیلنجوں پر قابو لیا، مسلمانوں کا یہ امتیاز تھا کہ وہ ہر مصیبت وخطروں کے وقت متحد ہوجاتے تھے اور استقلال وپامردی اوردینی وملی غیرت وحمیت کا ایسا ثبوت دیتے تھے کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں، نئے نئے چیلنجوں اور غیرمعمولی مصائب وآزمائش ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ کر سکے، وہ دشمنوں کے وسائل اورفوجی طاقت وقوت سے مرعوب نہ ہوئے، بلکہ چٹان کی طرح دشمنوں کے مقابلہ پر ڈٹے رہے، بڑے صبر واستقلال، غیرت وحمیت، خودداری وجوانمردی اور احساس خودی سے مشکلات ومصائب کا مقابلہ کیا، چنانچہ ان کی پریشانیاں دوور ہوگئیں، اور اورمصائب کے بادل چھٹ گئے۔

کسی بھی تحریک کی کامیابی اس کے طریقہ کار، پالیسی، عزم وارادہ، خود اعتمادی، احساس خودی، حقیقت شناسی اور دشمن کے عزائم ومنصوبوں سے واقفیت پر منحصر ہے، اور پھر اس واقفیت کی روشنی میں جدوجہد کے ہر میدان میں تیاری کی جائے، جب ہم عالم اسلام اور دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان موازنہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دونوں کے درمیان بڑا فرق اور بہت بڑا خلا ہے، دنیائے اسلام کی قیادتیں احساس ذمہ داری اور دینی وملی اورقومی جذبہ سے خالی ہیں، جبکہ مخالف قیادتیں ملی وقومی جذبات سے سرشار ہیں۔ حالیہ برسوں میں عالم عربی کے متعدد ملکوں میں رونما ہونے والے عوامی انقلابات اور انقلابات کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال اس کی دلیل ہے۔

دنیائے اسلام نے انیسویں صدی عیسوی میں مغرب کی تقلید ونقالی شروع کی، اور اب تک اسی روش پر قائم ہے، حالانکہ تقلید ونقالی کا زمانہ مختصر ہوتا ہے، اس لیے کہ جب تقلید کرنے والا سن شعور کو پہنچتا ہے، تو نقالی کو چھوڑ کر ابداع اور جدت کا طریقہ اختیار کرتا ہے، اپنے لیے نیا راستہ تلاش کر لیتا ہے، پھر اپنے سابق استاذوں کے احکام قبول نہیں کرتا، اور یہ طبعی قانون ہے، لیکن دنیائے اسلام کی سیاسی قیادتیں یورپ کی دوصدیوں سے نقالی وتقلید کرتی چلی آرہی ہیں، یورپ کے فکری رجحانات اور سیاسی اور تہذیبی نظام کو اپنے ملکوں میں نافذ کررہی ہیں، حالانکہ بہت سے مغربی مفکرین خود مغربی آئیڈیالوجی اور یورپی تصورات ونظریات پر تنقید کررہے ہیں اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مغربی آئیڈیالوجی نے انسانیت کو فائدہ کم نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔

اس وقت عالم اسلام کا بڑا المیہ، احساس خودی کا فقدان ہے، قومی، ملی وفکری امتیاز، اسلامی شناخت اور دینی وقار واعتبار بحال کرنے کے عزم وارادہ کا فقدان ہے، آپسی ٹکراؤ ہے، دین بیزاروں اور اسلام پسندوں کی آویزش ہے، اور دہشت گردی کے نام پر اسلامی عنصر کو کچلا جارہا ہے، دینی اور اسلامی تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جارہی ہیں، اسلامی تنظیموں اور اداروں اور اسلام پسند سیاسی قائدین پر پابندی لگائی جارہی ہے، دوسری طرف اسلام مخالف تنظیموں اور دین بیزار سیاسی تحریکوں کو کھلی آزادی دی جارہی ہے، یورپ کے اس نظریہ کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ ''مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور سیاست کا مذہب سے کوئی جوڑ نہیں'' اور اس سے بڑھ کر حکام کے ذہنوں میں یہ بٹھایا جارہا ہے کہ اسلام، دہشت گردی اور تشدد کا مذہب ہے، اور ان کے ذہنوں اور دلوں میں اسلام کا خوف بیٹھ گیا ہے، یہ نتیجہ ہے اس فکر وفلسفہ کا جو قرون وسطی میں صلیبی جنگوں کے اثر سے یورپ میں پیدا ہوا، اور پھر یورپ نے اپنے اسکول، نظام تعلیم اور تربیتی وسائل کے ذریعہ اپنے یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں کے ذہنوں کو اس فکر کے مطابق ڈھال دیا۔

دعوت اسلامی کے میدان میں کام کرنے والوں نے اس ''گمراہ کن تصور'' کا مقابلہ کرنے میں کوتاہی کی اور لوگوں میں اس کا تعارف نہیں کرایا کہ اسلام دین رحمت ہے، امن وآشتی کا مذہب ہے اور انسانی صلاح وفلاح کا داعی اور ضامن ہے، اس تعمیری فکر کو عام کرنے کے لیے ادارے بھی قائم نہیں کیے گئے کہ ان سے ایسے افراد تیار ہوکر نکلتے جو سیاست ومعیشت، تمدنی اور سلامتی اداروں میں کام کرتے اور سماج کے تمام شعبوں میں ان کا اثر ورسوخ قائم ہوتا، اگر ایسا ہوجاتا تو انگلیوں پر گنے جانے والے چند وظیفہ خوار حکام اور سیاسی قائدین، مسلم اقوام پر اپنی مرضی نہ تھوپ پاتے اور نہ خارجی طاقتوں کے منصوبوں اور مطالبوں کا نافذ ہی کر پاتے۔

مغرب کی چالبازیوں، دسیسہ کاریوں، سازشوں، عیاری ومکاری، دجل وفریب، خیانت وغداری، جانب داری اور حقارت آمیز سلوک کا تجربہ ہوجانے کے بعد اب وقت

آ گیا ہے کہ عالم اسلام اپنی ذات اور اپنی خودی کی طرف لوٹنے کی فکر وکوشش کرے، خودداری، عزت نفس، صبر واستقلال، تحمل وبردباری کی صفات سے متصف ہو، قومی عزت وشرافت اور ملی امتیاز کا یہ تقاضہ ہے، آج عالمی طاقتوں کی جانب سے مسلم ملکوں سے نصاب تعلیم، طریقہ تعلیم وتربیت اور دیگر امور میں تبدیلی کا مطالبہ کیا جارہا ہے، بلکہ بعض ملکوں میں عملی طور پر اس مطالبہ کو پورا کیا جارہا ہے، اس کا مقابلہ بغیر عزم راسخ، جہد مسلسل، عمل پیہم اور مضبوط وٹھوس پلاننگ کے نہیں کیا جا سکتا، موجودہ چیلنجوں اور مصائب وفتن اور موجودہ حالات کا مقابلہ صحیح عقیدہ، اسلامی اقدار وروایات، دینی واسلامی شعائر کی پابندی وحفاظت، سنت نبوی اور صحابہ کرام کے طریقہ کار کو اپنا کر ہی کیا جا سکتا ہے، ان تمام سیاسی قائدین سے (جو اسلام دشمن طاقتوں پر تکیہ کئے ہوئے ہیں) وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے موقف میں تبدیلی لائیں، تقلید کو چھوڑ کر خود اعتمادی اور خود اپنے وسائل پر بھروسہ کریں، امت مسلمہ کا اپنے اپنے قائدین سے مطالبہ ہے کہ وہ فیصلہ کن موقف اختیار کریں، جب رہنماؤں میں احساس وشعور پیدا ہوجائے گا اور صحیح موقف اختیار کرلیں گے تو ان کو اپنی قوم سے بھرپور تعاون ملے گا، اور عالم اسلام کے مختلف حصوں میں حکمراں طبقہ اور عوام کے درمیان جو کشمکش جاری ہے، وہ فطری طور پر ختم ہوجائے گی، اس کا مشاہدہ موجودہ ترکی میں کیا جا سکتا ہے۔

جو لوگ اپنے ملک کے نظام حکومت کے خلاف غصہ اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، ان کو بھی چاہئے کہ وہ دانائی وحکمت سے کام لیں، اور حکمراں طبقہ کو مطمئن کرنے کے لیے سنجیدہ طریقہ اختیار کریں، ردعمل اور تنقید کا راستہ چھوڑ کر دعوت واصلاح اور مفاہمت کا راستہ اختیار کریں، کیونکہ ٹکراؤ کے راستہ نے امت کو بہت نقصان پہنچایا ہے، لہٰذا تصادم کی راہ چھوڑ کر مفاہمت اور حکمت پر مبنی دعوت کا طریقہ استعمال کرکے حکمراں طبقہ کو مطمئن کریں اور ان کے اندر دینی وملی حمیت وغیرت اور احساس خودی پیدا کریں، اس لیے کہ آج امت کو جو مسائل درپیش ہیں، ان سے گلوخلاصی کا واحد راستہ یہی ہے ارشاد ربانی تعالیٰ ہے:

(اپنے پروردگار کی طرف بلائے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے، اور ان کے ساتھ بحث کیجئے، پسندیدہ طریقہ سے، بیشک آپ کا پروردگار (بھی) خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی ہدایت پائے ہوؤں کو (بھی) تو خوب جانتا ہے اور اگر تم لوگ بدلہ لینا چاہو تو انہیں اتنا ہی دکھ پہنچاؤ جتنا دکھ تمہیں پہنچایا گیا ہے، اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھا ہے، آپ صبر کئے رہئے اور آپ کا صبر تو بس اللہ ہی کی توفیق سے ہے، اور آپ ان پر غم نہ کیجئے، اور ان چالوں سے جو یہ لوگ چلتے رہتے ہیں تنگ دل نہ ہوجایئے، بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ (رہتا ہے) ہے جو تقویٰ اختیار کیے رہتے ہیں اور جو لوگ نیک کار ہیں)۔

لہٰذا موجودہ صورتحال میں اسلامی تنظیموں اور تحریکوں کی ذمہ داری ہے کہ ٹکراؤ اور مزاحمت کا راستہ چھوڑ کر اصلاح ودعوت کا راستہ اختیار کریں، حکمت وتدبر کے ساتھ منظم طریقہ پر اشتعال انگیزی اور خودنمائی سے بچتے ہوئے کام کریں، ذہن سازی کریں، اسلامی تعلیمات کے لیے زمین ہموار کریں، دین ودنیا کا جامع اور ہمہ گیر اسلامی نظام حیات کو عملی طور پر پیش کریں اور اسلام اور مسلمانوں کے تئیں پائے جانے والے شکوک وشبہات کا ازالہ موثر اور مطمئن کرنے والے انداز میں کریں۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی لکھتے ہیں:

''دینی دعوت وتبلیغ اور اسلامی تجدید کا کام اتنا آسان نہیں ہے، جتنا کہ سمجھ لیا گیا ہے، اس کا کام اور پیغام صرف اتنا نہیں ہے کہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام، اور ایک سیاسی واقتصادی نظام کی جگہ دوسرا سیاسی واقتصادی نظام لایا جائے، نہ علم وثقافت کو عام کرنا، جہالت کو مٹانا، بے کاری وبے روزگاری کے خلاف جنگ چھیڑنا ہے اور نہ ہی معاشرتی واخلاقی خرابیوں کا علاج اس ڈھنگ سے کرنا ہے، جس طرح یورپ کے مصلحین اور مغرب کے رفارمر کیا کرتے ہیں، اس دعوت کا کام تو اس ''اسلام'' کی طرف بلانا ہے، جو عقیدہ، عمل، اخلاق وکردار، عبادت وسیاست، انفرادی واجتماعی سلوک سب پر حاوی ہے، اس میں قلب، ذہن ودماغ اور جسم وروح شامل ہیں، کوئی چیز اس کے دائرۂ بحث سے خارج نہیں، اس دعوت میں دل، دماغ، انداز فکر، انسانی نفسیات، عقائد، ذہنیت، سب کے اندر گہری تبدیلی لائی جاتی ہے، اس دعوت کا سرچشمہ قلب ہے، نہ کہ قرطاس وقلم اور تقریر کا اسٹیج، یہ وہ دعوت ہے، جو امت پر نافذ ہونے سے پہلے داعی کے جسم پر نافذ اور اس کی پوری زندگی پر اثرانداز ہوتی ہے۔''